اقبالؔ اور رومی کا تصورِ عشق

پروفیسر منظر حسین

Love has a central importance in the personality and poetry of Allama Iqbal and Maulana Jalaluddin Rumi. In both of them, love is the main force in the creation of the universe and the evolution of human life. Thus, according to them, the passion of love is the reason for the origination of the universe and also the rule for determining the purpose of human existence. In our intellectual history, the famous Islamic philosopher Avicenna was the first to give the term Ishq the meaning of universal life force and called it the basis of a permanent system of philosophy. If the poetry of Maulana Jalaluddin Rumi and Allama Iqbal are compared, then both of them have many similar concepts regarding love, as if the concept of love is derived from the same source. Both great poets and sages have the same characteristics of love. In this article, in the light of Maulana Jalaluddin Rumi's Persian poetry i.e. Masnavi Manawi and Dewan Shams Tabriz and Allama Iqbal's Persian poetry, different aspects of the concept of love have been highlighted.

رومی اور اقبالؔ دونوں کی شخصیت اور شاعری میں عشق کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ دونوں کی نگاہ میں تخلیقِ کائنات اور حیاتِ انسانی کے ارتقاء کے پس پردہ عشق ہی ہے۔ اسی جذبے نے خدا کو تخلیق پر مائل کیا۔ لہٰذا عشق کا جذبہ باعث ایجاد عالم بھی ہے اور مقصد ہستی کے اصول کا ذریعہ بھی۔ عشق ہی کے بدولت انسان کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کائنات صرف اس کے اور اسی کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ عشق وہ نعمت کبریٰ ہے جو یقین کا راستہ دکھاتا ہے۔ زندگی کو با مقصد بناتا ہے اور مرد مومن میں الٰہی صفات پیدا کرتا ہے۔ اس میں ہوا و ہوس کا شائبہ تک نہیں۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

مسلمانوں کے ہاں صدیوں سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کی اصطلاحیں زبان زد عام ہیں۔ عشق حقیقی سے

بعض اوقات انسانوں کی باہمی بےلوث محبت مراد ہوتی ہے جس میں خودغرضی، نفسانیت یا جنسیت کا کوئی شائبہ نہ ہو اور بعض اوقات اس کے معنی عشق الٰہی ہوتے ہیں، یعنی اشخاص واشیاء کی محبت کے ماورائی خدا کا عشق اور یہ عشق حقیقی دل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا دل ہر قسم کی حرص وہوس سے پاک ہو جائے۔

سرمد غم عشق بو الہوس را ندہند　　　سوز دل پروانہ مگس را ندہند''[1]

عشق کی اصطلاح کو عالمگیر قوتِ حیات کے معنی پہنانے اور عشق کو ایک مستقل نظام فلسفہ کی بنیاد بنانے کا سہرا مشہور اسلامی فلسفی بوعلی سینا کو ہے جس نے اپنے رسالہ 'عشق' میں عشق کا ایک منظّم فلسفیانہ تصور پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

ایک عالمگیر جذبہ حیات ہے جو حیات کے نباتی اور حیوانی مدارج سے لے کر انسان کے روحانی ارتقا تک ہر سطح پر حرکت اور ارتقا کے محرک جذبہ کی حیثیت سے کارفرما ہے۔[2]

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ہر عمل عشق کے جذبے سے معمور ہے۔ یہ ایک ایسا آفاقی جذبہ ہے جس کی وسعتیں زمان ومکاں کی پابند نہیں۔ عشق سکون وطمانیت کا ضامن بھی ہے اور خدا کی معرفت کا ذریعہ بھی اور خالق کے قرب کا وسیلہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایتها النفس المطمئنة o ارجعی الی ربك راضية مرضيةo فادخلی فی عبادی o وادخلی جنتیo"[3]

اے نفس مطمئن! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش--- پھر شامل ہو جا میرے خاص بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔''

اس آیت کریمہ میں ''مطمئنہ'' سے مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی اطاعت سے سکون وقرار پاتا ہے اور اس کے ترک کرنے سے بےچینی محسوس کرتا ہے۔ رومی اور اقبال دونوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی اور فن میں تب وتاب حاصل کرنے کے لیے عشق ضروری ہے۔ رومی عشق کو کائنات کی حرکی قوت تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ عشق نہ ہو تو پوری کائنات کثیف، افسردہ اور منجمد رہتی ہے۔ عشق کی بدولت ہی ہر چیز اپنی اصل کی طرف مصروفِ سفر ہے۔ رومی کہتے ہیں:

دورِ گردوں راز موج عشق واں　　　گر نہ بودی عشق بفسرد جہاں
کے جمادی محو گستی درنبات　　　کے خدائے روح گشتی نامیات
ذرہ ذرہ عاشقاں آن کمال　　　می شتابد در علو ہمچو نہال[4]

دوسری جگہ عشق کو ایک کائناتی احساس گردانتے ہیں۔ انسان کے اندر جو حرکت اور ارتقا ہے سب عشق کی بدولت ہے۔ جذبہ عشق سے ہی نفسیاتی رذائل دور ہوتے ہیں۔ جنون عشق سے بہتر کوئی چیز نہیں

وہی تمام رذائل کا معالج ہے۔ دیکھیے یہ اشعار۔

ہر کہ اجامہ ز عشقے چاک شد　　　او زحرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نحوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما
جسم خاک از عشق برافلاک شد　　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد[۵]

ترجمہ: جس کا جامہ عشق کی وجہ سے چاک ہو، وہ حرص اور عیب سے بالکل پاک ہوا
خوش رہ ہمارے اچھے جنون والے عشق، اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب
اے ہمارے تکبر اور عزت بخشی کی دوا، اے کہ تو ہمارا افلاطون اور جالینوس ہے
خاکی جسم عشق کی وجہ سے آسمانوں پر پہونچا، پہاڑ ناچنے لگا اور ہوشیار ہو گیا

رومی نے عشق و محبت کے سبق کو عام کرنے پر اپنی مثنوی میں متعدد جگہوں پر زور دیا ہے۔ اپنے اشعار میں عشق کو ہی کائنات کی بنیاد اور مغز کائنات تسلیم کرتے ہیں۔ دیکھیے یہ اشعار:

گرنبودی عشق، ہستی کی بدی　　　کی زدی نان برتو و کی تو شدی[۶]

دوسری جگہ کہتے ہیں کہ عشق کے علاوہ میرا کوئی دمساز نہیں۔ نہ ہی کوئی اول ہے اور نہ ہی کوئی دمساز:

جز عشق نبود ہیچ دمساز مرا　　　نے اول و نے آخر و آغاز مرا[۷]

رومی کے نزدیک عشق ایک ایسا مذہب ہے جو ذاتِ حقیقی کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

ملت عشق از ہمہ دینہا جداست　　　عاشقان را ملت و مذہب خداست[۸]

وہ کہتے ہیں کہ جو شخص دریائے عشق میں جتنا زیادہ غوطہ زن ہوگا اسی قدر زیادہ وہ منشائے الٰہی کی قربت حاصل کرے گا۔

علت عاشق ز علت ہا جداست　　　عشق اصطرلاب اسرار خداست[۹]

ترجمہ: عاشق کی بیماری اور بیماریوں سے جدا ہے، عشق خدا کے بھیدوں کا اصطرلاب ہے۔

رومی عشق کو خوش سودائی سے موسوم کرتے ہیں اور اپنی جملہ بیماریوں کا مداوا عشق کے دامن میں تلاش کرتے ہیں:

شادباشاے عشق خوش سودائے ما　　　ای طبیب جملہ علت ہائے ما[۱۰]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا رومی نے لوگوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ سبھوں کو عشق حقیقی کی خصوصیات وصفات سے خود کو متصف کرنا چاہیے۔ دیکھے یہ اشعار:

پارسی گو چہ گرچہ تازی خوشتر　　　عشق را خود صد زبان دیگر است[۱۱]

عشق شنگ بے قرار بے سکون　　　چوں در آرد کل تن را در جنوں[۱۲]

وہ عشق کے فوائد کو ایک رباعی میں اس طرح اجاگر کرتے ہیں:

از عشق دلا، نہ بر زیاں خواہی شد　　　بے جان ز کجا شوی کہ جاں خواہی شد

اول بہ زمین از آسماں آمدہ ای　　　آخر ز زمیں بر آسماں خواہی شد[۱۳]

ترجمہ: تو عشق الٰہی کی وجہ سے کبھی خسارہ میں نہ رہے گا۔ جب خود سراپا جان ہو جائے گا تو بے جان کیسے رہے گا۔ تو پہلے آسمان سے زمین پر آیا تھا۔ انجام کار زمین سے آسمان پر جائے گا۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ عشق کو مولانا نے اپنی شاعری میں بہت اہمیت دی ہے ان کی پوری شخصیت بحرِ عشق میں غوطہ زن ہے۔ ان کے نزدیک عشق مذہب کا اصل جوہر ہے۔ عشق راحت و تکلیف کے احساس سے مبرا ہوتا ہے اور جزا و سزا کی فکر سے مستغنیٰ۔ انہوں نے اپنی مثنوی اور غزلوں کے مختلف اشعار میں عشق کی کرشمہ سازیوں، اس کی مختلف جہات اور وجود کی پرتوں کی نقاب کشائی کی ہے ان کے نزدیک ایمان کی افادیت اسی وقت ممکن ہے جب اس کی جڑیں عشق کی زمین میں پیوست ہو۔ دیکھیے یہ اشعار:

دین من از عشق زندہ بودن است　　　زندگی زیں جان وسر ننگِ منست

از وجود از عدم گر بگذری　　　از حیاتِ جاودانی بر خوری[۱۴]

میرا دین و ایمان بھی عشق میں ڈوب ڈوب کر جینا ہے۔ اس ظاہری زندگی سے جو جان و سر سے ہے زندہ رہنا میرے لیے باعث شرم ہے۔ تم اگر وجود و عدم سے گزر جاؤ تو ابدی زندگی تمہارے دم نقد ہو جائے گی۔

رومؔی نے اپنی مثنوی میں مختلف تاریخی واقعات اور تلمیحات کے حوالے سے بھی عشق کی اثر انگیزی کے باب وا کیے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ حضرت یوسف اور زلیخا کے عشق کی تفصیل بیان کی ہے۔ اسی طرح عرب کے بادشاہ امراؤ القیس اور اس کے عشق کے قصے بیان کیے گئے ہیں اور عشق کے لوازم کی تعریف کی گئی ہے کہتے ہیں:

بہر بزرگاں شہد و برطفلانست شیر　　　او بہر کشتی بود من الاخیر

کہ جوں درکشتی رود غرقش کند　　　تا بقعر از پاے تا فرقش کشد[۱۵]

عشق بڑوں کے لیے شہد اور بچوں کے لیے دودھ اور ہر کشتی کا وزن ہے کہ جب یہ کشتی (انسان کا جسم) میں پہنچ جائے تو اسے سر سے پاؤں تک گہرائی میں لے جا کر غرقاب کر دے۔

مولانا نے عشق کے مختلف گوشوں کو اپنی غزلوں میں بھی بے نقاب کیا ہے۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ جستہ جستہ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آں روح را کہ عشق حقیقی شعار نیست　　　نا بودہ بہ کہ بودن او غیر عار نیست

در عشق باش کہ مست عشقست ہر چہ ہست　　　بے کاروبار عشق بر دوست بار نیست[۱۶]

وہ روح جس کا شعار کبھی عشق حقیقی نہ رہا اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کا وجود عار و ننگ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ عشق میں مست و بیخود ہو جاؤ کیونکہ جو کچھ ہے عشق ہے۔ دوست کے لیے اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو صرف عشق کرو کیونکہ کاروبارِ عشق اس پر بار نہیں۔

ایک دوسری غزل میں فرماتے ہیں:

عشق اندر فضل و علم و دفتر و اوراق نیست
ہر چہ گفت و گوئی خلق آں رہ رہ عشاق نیست
شاخ عشق اندر ازل دان بیخ عشق اندر ابد
ایں شجر را تکیہ بر عرش ثریٰ و ساق نیست [۱۷]

عشق فضل و کمال علم، کتابوں اور اوراق کا نام نہیں مخلوق کی ساری قیل و قال عاشقوں کی رہبر نہیں۔ عشق ایسا درخت ہے جس کی شاخیں ازل میں اور جڑیں ابد میں پیوست سمجھو۔ یہ درخت نہ عرش پہ تکیہ کیے ہوئے ہے۔ نہ زمین پر اس کا کوئی تنا ہے۔

عشق اور اس کے لوازم کے حوالے سے رومی کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

عشق شاہیست سخت غیرت ناک　　　کو کند خانہ را زغیرت پاک
عشق مرغ بلند پرواز است　　　دائر اندر ہوائے او افلاک
عشق را دہ مقام می گویم　　　باتو اے یار گر کنی ادراک
ادب ست اولیں مقام و دوم　　　ترس و بیمست دیدہ نمناک
سو مش تقویت و چارم صبر　　　ہست تقدیم پنجمی ادراک
ششمش مسکنت، نہم عرفاں　　　دہمیں ہم بگویمت بیباک
چوں سناسی تو نفس خود بہ یقیں　　　عارف حق شوی فداک دواک
گفت شمس ایں جوابت اے فرزند　　　کہ پذ پر یش عاشق و چالاک [۱۸]

عشق ایک بیحد غیرت مند بادشاہ ہے جو تیرے گھر کو غیر سے پاک کرتا ہے۔ عشق بلند پرواز پرندہ ہے جو پوری دنیا کو اپنے دائرے میں سمیٹے ہوا ہے۔ یار! اگر تم سمجھ سکو تو میں تمہیں عشق کے دس مقامات بتاتا ہوں۔ اس کا پہلا مقام ادب، دوسرا خوف و امید اور چشم تر ہے۔ تیسرا تقویٰ و پرہیزگاری اور چوتھا صبر ہے۔ پانچواں ادراک ہے۔ چھٹے مقام کو سخاوت اور ساتویں کو علم جانو۔ آٹھواں مقام انکساری و عاجزی سمجھو اور نواں عرفان ہے۔ دسواں میں صاف صاف بیان کرتا ہوں اگر تو نے اپنے آپ کو صحیح طور پر پہنچان لیا تو حق کا عارف ہو گیا۔ شمس تبریزی نے کہا بیٹے! یہ تیرا جواب ہے اگر تو نے اسے قبول کر لیا (گرہ میں باندھ لیا) تو عاشق و ہوشمند ہو گیا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا رومی کے افکار میں عشق کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عشق کے رموز و نکات کے حوالے سے خود شناسی و خدا شناسی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ عشق کے مقام کو اعلیٰ و ارفع مرتبہ عطا کیا۔ آیئے اب شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی شاعری میں عشق کی کرشمہ سازیوں اور اس کی مختلف جہات کی پرتوں کی نقاب کشائی کی جائے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے یہاں عشق کو وہی مقام حاصل ہے جو رومی کے یہاں ہے۔ دونوں مفکرین عشق کو خدا شناسی و خود شناسی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک عشق معرفتِ خدا کی ایک وجدانی تعبیر ہے۔ شاعرِ مشرق کو مثنوی مولانائے روم کے مطالعے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مثنوی کا کلیدی موضوع 'عشق' ہے۔ ہر دفتر اور ہر حکایت میں اول تا آخر عشق ہی کا نغمہ ہے۔ مثنوی کی اسی خوبی نے اقبال کو مولانا رومی کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔

> فی الجملہ رومی سے اقبال کی بے پناہ عقیدت کا سب سے بڑا سبب بس یہی ہے کہ مثنوی کے اندر انہیں وہ کنجی مل گئی جس سے انھوں نے دین اور فلسفہ کے دروازے کے تمام خزانے کھول دیے یعنی کائنات اور حیات کے جملہ مسائل حل کر لیے اور وہ کنجی 'عشق' ہے جس کے لیے قرآن نے 'حب' کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع کرو۔ اللہ خود بخود تم سے محبت کرنے لگے گا۔[۱۹]

شاعرِ مشرق رومی کے اسی نظریے کی تقلید کرتے ہیں شاعرِ مشرق 'جاوید نامہ' میں عشق کی فضیلت اور اسرار و رموز کو اجاگر کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی۔ ان کے نزدیک عشق نہ تو برس اور مہینے کی قید کا پابند ہے اور نہ اس کے سامنے نزدیک دور یا جلد اور دیر کوئی شے ہے۔ ایسی بات نہیں کہ اقبال سرے سے عقل کی نفی کرتے ہیں بلکہ عقل کو اپنی جگہ پر ضرور اور مفید سمجھتے ہیں لیکن عشق کو عقل پر تفوق حاصل ہے۔ عقل پہاڑ میں سوراخ کرتی ہے اور اس کے گرد طواف کرتی ہے لیکن عشق کے سامنے خود پہاڑ کا وجود مثل تنکے کے ہے۔ دل جو مرکزِ عشق ہے مہینہ کی طرح تیز رو ہوتا ہے۔ لہٰذا عشق کے ہی بدولت انسان لا مکاں پر شب خوں مار سکتا ہے۔ یعنی زمان و مکاں پر غالب آ سکتا ہے۔ وہ مرتا بھی ہے مگر عام آدمیوں کی طرح نہیں بلکہ بلا قبر کے دنیا سے چل بستا ہے۔ عشق کا یہ زور مادی نہیں اور نہ اس کی طاقت سخت اعصاب کا نتیجہ ہے۔ یہ عشق ہی کی کارفرمائی ہے کہ جو کی روٹی کھا کر لوگوں نے درِ خیبر اکھاڑ پھینکا اور یہی جو کی چپاتیاں کھانے والے نے چاند کو شق کر ڈالا۔ بغیر مار کے نمرود کا منہ توڑ ڈالا اور بغیر لڑے بھڑے فرعون کے لشکر کو شکست دی۔ عشق راکھ بھی ہوتا ہے اور چنگاری بھی۔ اس کا معاملہ دین و دانش سے بلند تر ہوتا ہے۔ عشق ایسا بادشاہ ہے کہ دونوں جہاں اس کے زیرِ نگیں رہتا ہے۔ زمان و مکاں، ماضی و مستقبل، نیچے اور اوپر ہر جگہ اس کی اعجاز

آفرینیاں ہیں جب خدا سے خودی مانگتا ہے تو اس میں اس قدر طاقت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ساری کائنات پر حکمراں ہو جاتا ہے۔ سارا عالم بہ منزلہ سواری اور وہ خود بحیثیت سوار ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

می نداند عشق ماہ و سال را ـــ دیر و زود نزد و دور راہ را
عقل در کوہ شگافے می کند ـــ یا بگرد اوطوافے می کند
کوہ پیش عشق چوں کاہے بود ـــ دل سریع السیر چوں ماہے بود
عشق شبخونے زدن بر لا مکاں ـــ گور را نا دیدہ رفتن از جہاں
زور عشق از باد و خاک و آب نیست ـــ قوتش از سختی اعصاب نیست
عش بانانِ جویں خیبر کشاد ـــ عشق درانداممِ مہہ چاکے نہاد!
کلمۂ نمرود بے ضربے شکست ـــ لشکر فرعون بے حربے شکستِ
عش درجاں چوں بچشم اندر نظر ـــ ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر وہم اخگر است ـــ کار اواز دین و دانش بر تراست
عشق سلطاں است و برہاں مبیں ـــ ہر دو عالم عشق را زیر نگیں
لازماں و دوش فردائے ازد ـــ لا مکاں و زیر و بالا ئے ازد
چوں خودی را از حذر طالب شود ـــ جملہ عالم مرکب او راکب شود[۲۰]

ان اشعار کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے نزدیک انسان عشق کے ذریعہ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے اور زمان و مکان پر غالب آ سکتا ہے۔ اپنی اس صلاحیت سے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کر سکتا ہے جسے قرآن نے ''صبغت اللہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال اسی نکتے کی وضاحت ''جاوید نامہ'' کے آخری حصہ بہ عنوان ''ندائے جمال'' میں کرتے ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں پہنچ کر خدا سے گفتگو کے دوران چھ نکاتی سوال کرتے ہیں:

زندہ رود

من کیم ؟ تو کیستی ؟ عالم کجا ست؟ ـــ درمیان ماؤ تو دوری چراست؟
من چرا در بندِ تقدیرم بگوئے ـــ تو نمیری من چرا میرم بگوئے[۲۱]

یعنی میں کون ہوں؟ تو کون ہے؟ یہ عالم کہاں ہے؟ ہمارے اور تیرے درمیان دوری کیوں ہے؟ میں پابندی تقدیر کیوں ہوں؟ یعنی مجبور کیوں ہوں؟ تو فانی ہے اور میں غیر فانی ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟

زندہ رود کے ان سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

بودۂ اندر جہانِ چار سو ـــ ہر کہ گنجد اندر و میرد ورد

زندگی خواہی خودی را پیش کن　　　　چار سو را غرق اندر خوش کن
باز بینی من کیم تو کیستی　　　　در جہاں چوں مردی و چوں زیستی [۲۲]

یعنی اگر تم حیات ابدی کا آرزومند ہو تو عشق اختیار کرو۔ اس کی بدولت تم زمان و مکاں پر غالب آ سکتے ہو اور تمہاری حیثیت حکمراں کی ہو جائے گی اور تمہارے اندر صفت تخلیق بھی پیدا ہو جائے گی۔ میرے اور تمہارے درمیان یہ دوری اس لیے ہے کہ میں زمان و مکاں پر حاکم ہوں لیکن تم ان کے محکوم ہو لیکن تم بھی اگر ''چارسو'' پر غالب آ جاؤ تو مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔

اقبال کے یہاں عشق وہ قوتِ محرکہ ہے جس کے وسیلے سے زندگی اور فن میں تب و تاب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عشق کاروانِ وجود کو ہر لحظہ نئی شان سے آگے بڑھانے پر اکساتا ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم [۲۳]

☆☆☆

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ممکن است [۲۴]

پیام مشرق میں ایک چھوٹی سی نظم 'عشق' کے عنوان سے ہے جس میں اقبال نے عشق کی کئی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ عقل کی مدد سے انسان دنیا میں تباہی تو پھیلا سکتا ہے لیکن دوسروں کو راحت پہنچانے کے لیے اپنی جان جوکھم میں نہیں ڈال سکتا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کی عقل عشق کے تابع ہو جائے۔ گویا کوئی شخص دنیا کو منور کرنا چاہے تو اسے مسلکِ عشق اختیار کرنا پڑے گا۔

عقلے کہ جہاں سوز دیک جلوۂ بیباکش　　　　از عشق بیاموز و آئین جہاں تابی
عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد　　　　از تاب و تب رومی تا حیرتِ فارابی
ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم　　　　از عشق دل آساید با ایں ہمہ بیتابی [۲۵]

ترجمہ:

دنیا کو جلاتی ہے جو عقل جلالت سے　　　　وہ عشق سے پاتی ہے آئین جہاں تابی
ہے عشق ہی سے پیدا کیفیت جاں ہر اک　　　　تاب و تب رومی ہو یا حیرتِ فارابی
میں ناچتے گاتا ہوں یہ نغمہ نشاط آور　　　　ہے عشق قرار دل گو ہے ہمہ بے تابی

ان اشعار میں اقبال مسلکِ عشق کے علمبردار ہیں اور جن کے نزدیک عشق کا ثمرہ تب و تاب ہے۔

علی الرغم اس کے فارابی عقل کا نمائندہ ہے جو حیرت واستعجاب میں محصور ہے۔اقبال کا عقیدہ ہے زندگی اور فن دونوں میں عشق ہی کا جلوہ ہے کہتے ہیں: ؎

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم[۲۶]

اقبال کے نزدیک عشق وہ حرارت ہے جو ساری حیات کو زندگی بخشتی ہے۔

عشق ہے نورِ حیات، عشق ہے نارِ حیات　　　عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات[۲۷]
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے　　　عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے[۲۸]

اقبال کا عقیدہ ہے کہ عشق کی مدد سے دانائی حق شناسی ہوتی ہے اور اس سے کارِ عشق کی بنیاد مستحکم ہوتی ہے۔عشق جب دانائی کے ساتھ گھل مل جاتا ہے تو اس سے ایک دوسرا ہی عالم وجود میں آتا ہے۔اٹھو اور ایک دوسرے عالم کی تخلیق کرو اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تم عشق اور دانائی کو باہم دگر متحد اور مخلوط کرو۔دیکھیے 'جاوید نامہ' کے یہ اشعار:

زیرکی از عشق گرد دحق شناس　　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں بزیرکی ہمبر شود　　　نقش بند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ　　　عشق را با زیرکی آمیز دہ[۲۹]

ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اقبال نے عشق کے نظریے میں تنوع اور بوقلمونی پیدا کی ہے۔بانگ درا میں ''محبت'' کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے تجزیاتی مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق بھی عشق ہی کا نتیجہ ہے۔قدرت نے اپنے حسن کے ان گنت جلوؤں کو اس دنیا میں بھیج کر اس کی تماشائی کی حیثیت سے انسان کو پیدا کیا۔کائنات کے ذرے ذرے میں اسی کا نور ہے اور ہر شے میں جذبۂ عشق اجاگر ہے۔پوری نظم کو نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمالِ علم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا

ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے
سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعی پیہم سے
پھرایا فکر اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت کی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیاز لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزاء کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے
ہوس نے پھر یہ پانی ہستی نو خیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے [۳۰]

عشق ومحبت کی وارفتگی ہی نے اقبال کو 'یقیں' کی لذت سے آشنا کیا۔ اقبال کے نزدیک 'عشق' سرمایۂ حیات ہے اور فکر وفن کا سنگِ بنیاد بھی۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری:

---اقبال کے یہاں عشق اور اس کے مترادفات و لوازمات یعنی وجدان، خود آ گہی، باطنی شعور، جذب، جنوں، دل، محبت، عشق، آرزومندی، درد، سوز، جستجو، مستی اور سرمستی کا ذکر جس تکرار، تواتر، انہماک، شدتِ احساس کے ساتھ ملتا ہے کسی اور موضوع کا نہیں ملتا۔ ان کے اردو اور فارسی کلام میں شاید ہی کوئی غزل یا نظم ہو جس میں ان الفاظ کے حوالے سے بات نہ کہی گئی ہو اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اقبال کے نظامِ فکر وفن میں عشق کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔[۳۱]

اقبال کے یہاں عشق حرکت وعمل کی وہ قوت ہے جو آرزوؤں اور تمناؤں میں آنکھ کھول کر کاروانِ وجود کو ہر لحظہ نئی شان سے آگے بڑھاتی ہے۔ اسی کے دم سے زندگی کی رنگینی ہے۔ ان کے یہاں افلاطون کی طرح سکونی زندگی کا خواب نہیں بلکہ ان کے عشق میں سوزش بھی ہے اور سرخوشی و سرمستی بھی۔ آہ و نالہ، سوز و ساز، تب و تاب اور درد و داغ سب کچھ پنہاں ہے۔ سکون و جمود کو وہ موت کے مترادف گردانتے ہیں کہتے ہیں۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات　　　　تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود[۳۲]

اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسانیت کی تاریخ کے کارناموں کے جو ابھرتے ہوئے نقوش دکھائی دیتے ہیں وہ عشق ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ اس طرح کی اکمل ترین مثالیں ہمیں صدق خلیل اور اسوہ حسین میں ملتی ہیں اور کارزار حیات میں بدر حنین کا واقعہ بھی عشق ہی کا کرشمہ ہے۔

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک　　　　اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا[۳۳]

آیئے! اب اقبال کے تصورِ عشق کے روحانی نظام کے بعض پہلوؤں کا جائزہ ان کی نظم 'مسجد قرطبہ' کے حوالے سے لیا جائے۔ اس نظم میں اقبال نے ایک نئی جہت سے 'عشق' کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ کائنات کی تمام چیزوں کو فنا نصیب ہے لیکن عشق کو فنائیت نصیب نہیں۔ لہذا عشق کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور سب سے بڑی طاقت بھی۔ عشق کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے جیسے خدا کا کلام عشق غیر فانی ہے جیسے دم جبریل۔ عشق کائنات کی مقدس ترین چیز ہے جیسے دلِ مصطفے۔ عشق ہی کائنات میں مقتدر اور حکمراں ہے جیسے فقیہ حرم اور امیر جنود۔ دیکھیے بالِ جبریل کی نظم 'مسجد قرطبہ' کا یہ بند۔

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو

عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دلِ جبرئیلؑ، عشق دم مصطفےؐ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نار حیات [۳۴]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا نظریۂ عشق ان کے یہاں کامل صورت میں نظر آتا ہے۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

عشق کی گرفت اس کے قلب پر ایسی ہے کہ ہزار طریقوں سے اس کا ذکر کرتا ہے مگر ہر شعر میں انداز بیان نرالا ہوتا ہے۔ کہیں خالی جذبے کا اظہار ہے اور کہیں یہ واضح کرتا ہے کہ زندگی میں عشق کا مقام اور وظیفہ کیا ہے۔ عشق کے متعلق اس نے جو کچھ کہا ہے، اگر سب کو جمع کیا جائے تو ایک دفتر بن جائے، کیونکہ دورِ آخر میں یہ مضمون اس کی تمام وجدانی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ [۳۵]

مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے تصورِ عشق کی ضمن میں رومی کے مثبت نظریے کو قبول کیا ہے۔ رومی کے نزدیک بھی دین کا جوہر عشق ہے اور اقبال کے نزدیک بھی ایمان کی کسوٹی عشق ہے۔ تصورِ عشق کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس ضمن میں اقبال رومی کے علاوہ عطار، سنائی اور حافظ وغیرہ سبھی شاعروں سے متاثر ہوئے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اقبال نے رومی کے تصورِ عشق ہی سے اپنا چراغ روشن کیا ہے اور اپنی بصیرت افروز حکیمانہ شاعری کی رفیع الشان عمارت تعمیر کی۔ رومی کہتے ہیں:

ع　ملت عشق از ہمہ دینہا جداست [۳۶]

اقبال کہتے ہیں:

جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی　　آہ کہ ہے تیغ تیز پردگی نیام ابھی [۳۷]

رومی کے یہاں بھی عشق کو جوہر دین کی حیثیت حاصل ہے دیکھیے یہ شعر:

گرچہ تفسیر زبان روشن گراست　　لیک عشق بے زباں روشن تراست [۳۸]

ایک دوسرے شعر میں عشق کو کائنات کا بنیادی سبب بتاتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں کہ کائنات کے مائل بہ ارتقاء ہونے کا راز صرف یہ ہے کہ ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹنے کی متمنی ہے۔ دیکھیے یہ شعر:

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　　باز جوید روزگار وصل خویش [۳۹]

یہاں اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ گرچہ تصورِ عشق کے سلسلے میں اقبال نے پیرِ رومی سے فیض حاصل کیا ہے اور عشق کو آگہی وخود آگہی کا سرچشمہ جانا ہے اور خدا شناسی کا معتبر ذریعہ بھی دونوں عشق کو معرفتِ خدا کی ایک وجدانی تعبیر تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن آگے جا کر رومی اور اقبال کے مقصدِ عشق میں تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے رومی وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں عشق کا مقصد وجودِ حقیقی سے اتصال ہے جب کہ اقبال آگے چل کر وحدت الوجود کے مخالف نظر آتے ہیں۔ لہذا رومی سے اکتساب حاصل کرنے کے باوجود عشق کو نئے نئے مفاہیم سے وابستہ کر لیا ہے۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں اقبال کا تصورِ عشق قوتِ نمود، ذوقِ عمل، جذبۂ تخلیق اور قوتِ تسخیر سے عبارت ہے۔ اس کو محض اضطراری کیفیت، ہیجانِ نفسی، خواس باختہ از خود رفتگی وغیرہ سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ میں اپنی گفتگو کو نکلسن کے نام اقبال کے ایک خط کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں جو اپنے تصورِ عشق کے بارے میں لکھا ہے:

> یہ لفظ "عشق" بہت ہی وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی کسی شے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور جزو بنا کر اپنا لینے کی آزادی کا نام عشق ہے جس کا کمال یہ ہے کہ تخیل پیدا کرے۔ قدر و مرتبہ پہچانے اور ساتھ ہی ادراکِ کامل سے اسے بروئے کار بھی لائے۔ حقیقت میں عشق کا کام یہ ہے کہ عاشق اور معشوق کو ممیّز کر کے اپنی اپنی جگہ انفرادی شخصیت اور اہمیت بخش دے۔ [۴۰]

آیئے! اب "عقل وعشق کے تقابل" کے حوالے سے اقبال اور رومی کے مابین مشابہت و افتراق کے پہلو کی تلاش کی جائے۔

اقبال اور رومی دونوں کے یہاں عشق کو غیر معمولی اہمیت وفضیلت حاصل ہے۔ دونوں کے یہاں عقل وعشق کا موازنہ بھی خاص موضوع رہا ہے۔ دونوں عقل کے مقابلے میں عشق کے ثنا خواں ہیں۔ لیکن دونوں عقل کے بالکل خلاف نہ تھے بلکہ عقل کو ادراکِ ظاہری کا ایک وسیلہ گردانتے تھے۔ انہیں قدیم یونان کے فلسفہ عقل کی قباحتوں کا علم تھا۔ سقراط کے تعقلات کا ماحصل یہ ہے کہ عقل کو ایک مطلق العنان اور ظالم فرماں رواں کی طرح نافذ کیا جائے۔ افلاطون سقراط سے بھی آگے نظر آتا ہے۔ وہ اپنے تصورِ اعیان وجود کو عقلی مانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اصل وجود صرف اعیان ہی کا ہے جو حواس کے نہیں عقل کے معروض ہیں۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو خدا کو عقلِ محض مانتا تھا اور اس کے تصور کو وجدانی کہتا تھا۔ یونانی فلسفیوں کے مذکورہ نظریوں کی تردید سب سے پہلے نیطشے نے کی اور عقلیت کا ابطال کیا۔ وہ کہتا ہے کہ حیات کے وہ تمام نظریے جو عقلیت

کے تصورات اور اعیان کی بنیادوں پر قائم ہیں حیات کش ہیں اور انسان کو سرورِ حیات کی لطف اندوزی سے محروم کر کے اس کی شخصیت میں فساد و انحطاط پیدا کرتے ہیں۔ اقبال اس معاملے میں نیطشے کے قریب دکھائی دیتے ہیں اور عقل کو جذبۂ حیات کی ایک ثانوی پیداوار گردانتے ہیں۔ افلاطون نے سقراط کے عقل محض کو بنیاد ماننے کے زیر اثر اپنے نظام فلسفہ کی بنیاد جس ''اعیان'' پر قائم کی ہے، رومی اور اقبال اس نظریے کی سخت مخالفت کرتے ہیں رومی نے افلاطون کے 'نظریہ اعیان' پر چوٹ کستے ہوئے کہا ہے:

صد ہزاراں سالہ از دیوانگی بگذشتہ ایم　　　چوں تو افلاطون عقلی رو تو را با ما چہ کار؟[۴۱]

رومی عقل کی افادیت کو بالکل مسترد نہیں کر دیتے لیکن ان کا ماننا ہے کہ اس میں انسانی وجود کی مشکلات کا حل نہیں ہے۔ عقل بذات خود بڑی بیش قیمت چیز ہے لیکن عشق کی رہنمائی کے بغیر وہ ہولناک تباہی کا آلہ کار بن سکتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عقلیت کی وجہ سے انسان میں تکبر کا احساس جاگزیں ہونے لگتا ہے۔ عالمانہ جستجو کے لیے اس کی اہمیت ہے لیکن روحانی تلاش و جستجو کی رہنمائی سے معذور ہے۔ مولانا رومی نے عقل کی تقسیم بندی دو حصوں میں کی ہے۔ ایک عقل وہ ہے جو حصول دنیا میں چست و چالاک ہے۔ دنیاوی ہر پیچ و خم کو آسانی سے سلجھا لیتی ہے مگر اللہ کی طرف رجوع کرنے سے روکتی ہے۔ یہ عقل کا وہ درجہ ہے جس کی نظر آخرت اور اصل پر نہیں ہے۔ دوسری قسم کی عقل وہ ہے جس کا تصور ہے کہ یہی مرتبہ وحدت ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ توفیق الٰہی سے سیر و سلوک کی دنیا میں فنا تک کا سفر ممکن ہے۔ رومی کے نزدیک پہلی قسم کی عقل کتابوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے جب کہ دوسری قسم کی عقل لوحِ محفوظ سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا حاصل ہونا محض اللہ کی نوازش ہے۔ عقل کل اللہ کی تخلیق ہے اور روحانیت کی رہنمائی بھی عام لوگوں میں وہ اس لیے بھی داخل نہیں ہو پاتی کیونکہ آدمی اپنے تکبر سے اس کے دخول کو روک دیتا ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ عقل کامل کی تلاش پیغمبروں اور اولیاء کی رہنمائی میں حاصل کرو ورنہ ہر لحظہ بھٹکنے کا امکان ہے۔ جس حق و صداقت کا انکشاف عقل محض کے وسیلے سے ہو اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہو سکتی جو وحی اور تنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے انسانیت کو بہت کم متاثر کیا ہے۔ مدینہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں ایک ستون کے رونے کا ادراک کسی عقل کے ذریعہ نہیں ہو سکتا لیکن روحانی بصیرت کے ذریعہ اس کو سنا جا سکتا ہے جسے وہ عشق سے موسوم کرتے ہیں۔ رومی عشق اور عقل کے مابین تقابل کرتے ہوئے اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں:

عشق اندر فضل و علم و دفتر و اوراق نیست
ہر چہ گفت و گوئی خلق آں رہ رہ عشاق نیست
شاخ عشق اندر ازل داں بیخ عشق اندر ابد

ایں شجر را تکیہ بر عرش و ثریٰ و ساق نیست
عقل را معزول کردیم و ہوا را حد زدیم
کایں جلالت لایق ایں عقل و ایں اخلاق نیست
تا تو مشتاقی بداں کایں اشتیاق تو بتی ست
چوں شدی معشوق از آں پس ہستی مشتاق نیست
مرد بحری دایما بر تختہ خوف و رجاست
چونک تختہ و مرد فانی شد جز استغراق نیست
عشق تبریزی توئی دریا و ہم گوہر توئی
زانک بودِ تو سراسر جز سر خلاق نیست[۴۲]

فضل و کمال،علم کتابوں اور اوراق کا نام نہیں۔مخلوق کی ساری قیل و قال عاشقوں کی رہبر نہیں ہے۔عشق ایسا درخت ہے جس کی شاخیں ازل میں اور جڑیں ابد میں پیوست سمجھو۔ یہ درخت نہ عرش پہ تکیہ کیے ہے نہ زمیں پر اس کا کوئی تنا ہے۔ہم نے عقل کو معزول کر دیا اور خواہشات نفسانی پر قدغن لگا دی اس لیے کہ عشق کی عظمت وجلالت اس عقل اور اس کی عادات واطوار کے لائق نہیں (بالاتر ہے) اگر تم عاشق ہو تو یہ عشق تمیارا بت ہے۔جب تم خود معشوق ہو گئے تو عاشق کی ہستی فنا ہو گئی۔انسان ہمیشہ خوف اور امید کے تخت پر سوار ہے۔جب تختہ ہٹ گیا تو اب استغراق (غرق) کے علاوہ کچھ نہیں رہا۔اے شمس تبریز! دریا بھی تو ہی ہے اور موتی بھی تو ہی ہے۔اس لیے کہ تیری ذات خلاقِ عالم کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔

رومی کے نزدیک عشق عقل سے فائق ہے۔ہم سوچ بچار کرنے کے لیے زندہ نہیں رہتے بلکہ زندہ رہنے کے لیے سوچ بچار کرتے ہیں۔رومی نے عقل کی کمتری اور عشق کو اس پر فوقیت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بھی ثابت کیا ہے۔کہتے ہیں کہ جب انسان کی تدابیر ناکام ہو جاتی ہیں تو اس کو قضائے خداوندی اور خدا کا یقین ہو جاتا ہے۔کبھی ارادے پورے بھی ہو جاتے ہیں کہ انسان مایوس نہ ہو جائے اور ارادے کی نیت ہی چھوڑ دے۔وہ ارادہ چھوڑ دے گا تو ارادے کے ٹوٹنے سے جو معرفت خداوندی حاصل ہوتی ہے وہ اس سے محروم ہو جائے گا۔اہل عقل اپنے ارادے کی پختگی کے باوجود اپنے مقاصد میں ناکام ہونے کی صورت میں حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔رومی اسے دوسرے لفظوں میں اس طرح کہتے ہیں کہ اہل عقل کی نامرادی جبر کی ہے لیکن عاشقوں کی نامرادی اختیاری ہے۔اہل عقل مجبوری کے بندے ہیں اور عاشقانِ حق اس محرومی میں وصل خداوندی کی نعمتیں حاصل کرتے ہیں۔رومی عشق کے مقابلے میں عقل کو شیطانی کہتے ہیں۔ان کے نزدیک عقل ابلیسی ہے اور عشق آدم سے ہے۔دیکھیے یہ اشعار:

داند او کو نیک بخت و محرمست   زیرکی ابلیس و عشق از آدمست
زیرکی سباحی آمد در بحار   کم رہد غرقست او پایانِ کار
عشق چوں کشتی بود بہر خواص   کم بود آفت بود اغلب خلاص[۴۳]

درج بالا تجزیے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ رومی عقل کے منکر نہ تھے بلکہ ان کا تصورِ عقل یونان کے مشہور مفکرین سقراط، افلاطون اور ارسطو کے اس نظریے کے متصادم ہے جس کی رو سے عقلیت اصلی اور حقیقی جوہر ہے اور جذبہ حیات کو اس کا تابع ہونا چاہیے رومی اس بات کے بھی شا کی ہیں کہ اسلامی ادب اور تصوف نے نادانستہ طور پر نو افلاطونیت طریق فکر کا اس قدر اثر قبول کیا ہے کہ اکثر صورت میں روح اسلامی سرے سے مفقود ہو گئی ہے۔ رومی نے افلاطون کے تصورِ عقل پر چوٹ کستے ہوئے کہا ہے:

صد ہزاراں سالہ از دیوانگی بگذشتہ ایم
چوں تو افلاطون عقلی رو تو را با ما چہ کار؟[۴۴]

صوفیوں نے عام طور پر عقل کو اس کے منفی رویے کی وجہ سے نشانہ بنایا ہے۔ عقل کا سب سے منفی پہلو یہ ہے کہ اس میں جرأت رندانہ کی کمی ہے اور بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے کا حوصلہ مفقود ہے۔ مشہور صوفی شاعر عطار نے کہا ہے کہ عقل دل زندہ سے اس کی مخفی دولت چھین لیتی ہے۔ ’’بغیر نورِ عشق کے صرف علم و عقل کے ذریعہ کوئی بھی انسان رازِ حیات کے اسرار کا سراغ نہیں لگا سکتا۔‘‘ رومی کہتے ہیں کہ بغیر عشق کے عقل اندھے کی لاٹھی کی طرح ہے جس کے ذریعہ کوئی ٹٹول ٹٹول کر آہستہ آہستہ ہی چل سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ گڈھے میں گر جائے لیکن عقل کے ساتھ روحانی بصیرت یعنی عشق کا امتزاج ہو تو عقل اس اندھے انسان کی لاٹھی کی طرح بیکار ہے جس کی بینائی لوٹ آئی ہو اور وہ سب کچھ دیکھنے لگا ہو۔ عشق اور عقل کے مابین تقابل کی ایک عمدہ مثال رومی کی اس غزل میں ملاحظہ فرمائیں جو فنی صفات و کمالات کی مثال ہے پوری غزل تشبیہات و تمثیلات سے مزین ہے۔ بیان میں ندرت بھی ہے اور رعنائی و بوقلمونی بھی۔

درمیانِ پردۂ خون عشق را گلزارہا
عاشقاں را با جمال عشق بے چوں کارہا
عقل گوید شش جہت حدست و بیرونِ راہ نیست
عشق گوید راہ ہست و رفتہ ام من بارہا
عقل بازارے بدید و تاجری آغاز کرد
عشق دیدہ زان سوئے بازار او بازارہا
اے بسا منصور پنہاں ز اعتمادِ جان عشق

ترک منبرہا بگفتہ برشدہ بر دارہا
عاشقانِ درد کش را در درونہ ذوقہا
عاقلانِ تیرہ دل را در درون انکارہا
عقل گوید پا منہ کاندر فنا جز خار نیست
عقل گوید عقل را کاندر توست آں خارہا
ہین خمش کن خار ہستی را ز پائے دل بکن
تا ببینی در درونِ خویشتن گلزارہا
شمس تبریزی توئی خورشید اندر ابر حرف
چوں برآمد آفتابت محو شد گفتارہا[۴۵]

ترجمہ:۔خون کے پردوں کے درمیان عشق کے بہت سے باغات ہیں عاشقوں کو ذاتِ باری سے کام ہے۔ عقل کہتی ہے کہ چھ سمتیں ہیں۔ان کے باہر کوئی راہ نہیں۔عشق کہتا ہے کہ میں بارہا اس سے گیا ہوں۔عقل کہتی ہے کہ پاؤں آگے مت بڑھانا۔فنا میں صرف کانٹے ہی کانٹے ہیں۔عشق کہتا ہے کہ وہ کانٹے تمہارے اندر ہیں۔عقل نے ایک بازار دیکھا اور تجارت شروع کر دی۔عشق نے اس بازار سے ماورا بہت سے بازار دیکھے۔منصور جیسے بہت سے لوگوں نے عشق پر اعتماد کیا اور منبر چھوڑ کر دار پر چڑھ جانا پسند کیا۔تلچھٹ پینے والے عاشقوں کو اسی میں لطف ہے۔تیرہ بخت، کج فہم، عقلمند کو اس کے ظاہر سے انکار ہے۔خاموش ہو جا اور ہستی کے کانٹوں کو دل کے پاؤں سے نکال دے تا کہ تو اپنے اندر گلزار دیکھے۔شمس تبریزی تو ہی ہر حرف کے امر میں خورشید ہے۔جب آفتاب ابر سے باہر نکل آیا تو باتیں ختم ہو گئیں۔

عقل و عشق کا تقابل اقبال کا بھی خاص موضوع رہا ہے انھوں نے اپنے بیشتر کلام میں عقل کی تنقیص کرتے ہوئے عشق کو عقل پر فوقیت دی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے عقل کے مقابلے عشق کی زیادہ ضرورت ہے قوموں کی تعمیر میں یقیناً عقل و خرد ناگزیر ہے لیکن ایک نیم مردہ قوم کو زندگی تو صرف عشق ہی کی بدولت آسکتی ہے۔عشق عقل سے زیادہ صاحب ادراک ہے۔کہتے ہیں:۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک[۴۶]

دوسری جگہ کہتے ہیں:

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ[۴۷]

اقبال ان لوگوں کو جو عقل پر تکیہ کرتے ہیں انہیں اس نکتے سے آگاہ کرتے ہیں:۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے　　　ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں[۴۸]

عقل و عشق کے تقابل کو اقبال نے 'پیام مشرق' کی ایک نظم 'حکمت و شعر' میں بھی پیش کیا ہے جس میں بوعلی سینا علم و حکمت کا نمائندہ ہے اور رومی اس شعر کا جسے اقبال نے ''نے نوازی' سے موسوم کیا ہے۔ دونوں جویائے حقیقت ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ شاعر تو محمل مراد تک پہنچ جاتا ہے لیکن فلسفی راستے کے گرد و غبار میں گم ہو کر منزل سے بھٹک جاتا ہے۔ حکمت و شعر دونوں حقیقت کے ترجمان ہیں لیکن اگر افراد اور اقوام کی زندگی میں انقلاب لانے کا معاملہ ہو تو وہاں حکمت کام نہیں آتی بلکہ نے نواز شاعر ہی بیماریوں کا مداوا بن سکتا ہے۔

بو علی اندر غبار ناقہ گم　　　دستِ رومی پردہ محمل گرفت
ایں فرو تر رفت و تا گوہر رسید　　　آں بگر دابے چوخس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　　شعر میگرد د چو سوز از دل است [۴۹]

اقبال کے نزدیک فلسفہ یعنی عقل بے سوز ہے جب کہ شعر یعنی عشق با سوز ہے۔ دونوں مل کر زندگی کی تکمیل کر سکتے ہیں اور اسی سوز کے لیے اقبال کا مشورہ یہ ہے کہ کسی ''فرد خیر'' کی صحبت اختیار کرے جو انتہائی ناگزیر ہے اور یہ سوز پیر رومی کے یہاں موجود ہے:

پیر رومی را رفیق راہ ساز　　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز [۵۰]

اسی مفہوم کا ایک شعر بال جبریل میں ملاحظہ ہو:

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا　　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں [۵۱]

جو کام عقل نہیں کر سکتی ہے وہ کام عشق کر دکھاتا ہے۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تار رفو [۵۲]

اقبال نے اپنے فارسی شعری مجموعہ ''پیام مشرق'' کی ایک نظم ''جلال و ہیگل'' کے عنوان کے تحت عقل و عشق کا تقابل کیا ہے جس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہیگل کا فلسفہ اپنی غیر معمولی شوکت اور عظمت کے باوجود سراب ہے جس کی کوئی وقعت یا حیثیت نہیں۔ ہیگل اور رومی کا مقابلہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ہیگل وہ فلسفی ہے جس کے فکر نے ازلی حقائق کو ان کے آنی و فانی لباس سے نکال کر قطعاً معریٰ کر دیا۔ جب میں نے اس کے فلسفے پر غور کیا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس کے فکر کے دریا میں غوطہ لگایا تو عقل کی کشتی طوفان میں پھنس گئی اور میں اسی عالم اضطراب میں سو گیا۔ خواب میں پیر و مرشد رومی کی زیارت ہوئی۔ اقبال نے انہیں ''پیر یزدانی'' کہہ کر پکارا۔ رومی نے اپنا چہرہ دکھایا۔ وہ چہرہ جو ہمہ آفتاب تھا اور جس کی تجلیات سے روم و شام سبھی روشن تھے۔ جس کا شعلہ اس تاریک دنیا میں راہنمائی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ کہنے لگے کہ کیا تم

نہیں دیکھتے یہ تو سراب اور دھوکا ہے۔ کیا عشق کی منزل خرد اور زیرکی کی وساطت سے حاصل کرنا ممکن ہے؟ یہ تو وہی ہوا کہ ایک چراغ کی مدد سے آفتاب کی تلاش کی جائے۔ دیکھیے یہ اشعار:

نگہ شوق تیز تر گردید   چہرہ بنمود پیر یزدانی
آفتابے کہ از تجلی او   افق روم و شام نورانی
شعلہ اش در جہانِ تیرہ نہاد   بہ بیاباں چراغِ رہبانی
معنی از حرف اوہمی روید   صفت لالہ ہائے نعمانی
گفت بامن، چہ خفتہ بر خیز!   بہ سرابے سفینہ می رانی؟
بہ خرد راہِ عشق می پوئی؟   بہ چراغ آفتاب می جوئی؟[۵۳]

اقبال اس نظم میں یہ واضح کرتے ہیں کہ ہیگل کے فلسفے سے معرفت الٰہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس کا دار و مدار منطق پر ہے اور منطق سے سب کچھ مل سکتا ہے خدا نہیں مل سکتا۔ لہٰذا ہیگل کا فلسفہ لفظوں کا طلسم ہے۔ محض پوست ہے جس میں مغز نہیں ہے یا صدف ہے جس میں موتی نہیں ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی   ہے اس کا طلسم سب خیالی[۵۴]

'پیام مشرق' کی ایک نظم 'ہیگل' میں ہیگل کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی عقل فکر پرواز کی حیثیت ایک باکرہ مرغی کی ہے۔ اگرچہ اس نے دلہن کا لباس پہن لیا ہو لیکن خلوتِ صحیح کی منزل سے نہیں گذری ہو بلکہ بغیر نر کے زورِ مستی سے انڈا دے دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے انڈے سے بچے نہیں نکل سکتے دیکھیے یہ اشعار:

حکمتش معقول و با محوس در خلوت نرفت   گرچہ بکر فکر او پیرایہ پوشد چوں عروس
طائر عقل فلک پرواز او دانی کہ چیست؟   تا کیان کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروش[۵۵]

''پیام مشرق'' میں ایک نظم ''جلال و گوئٹے'' کے عنوان سے بھی ہے۔ اقبال مغربی مفکر گوئٹے کے متعلق اس نظم میں وہی الفاظ استعمال کیے ہیں جو رومی کے متعلق کیے ہیں یعنی

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب[۵۶]

اس لیے اس نظم میں اقبال نے رومی کی زبان سے گوئٹے کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ گوئٹے کا فاؤسٹ جسے اقبال نے اس نظم میں 'قصہ بیان ابلیس وحکیم' کا نام دیا ہے اور رومی کے لیے اقبال نے 'پیرعجم' اور 'دانائے اسرار قدیم' کے القاب استعمال کیے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دن جنت میں گوئٹے کو مرشد رومی کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا گوئٹے نے رومی کو اپنی شاہکار فاؤسٹ پڑھ کر سنایا تھا جس میں گوئٹے نے انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے پڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔ فاؤسٹ کے قصے میں حکیم فاؤسٹ جو زیرکی (عقل) کا نمائندہ ہے، روح ابلیس کے

حوالے کرنے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن آخر کار جب ابلیس حکیم کی روح کو ہمیشہ کے لیے اپنے قبضے میں کرنے کے لیے خوش آمدید کہہ رہا ہوتا ہے، عشق کا پاکیزہ جذبہ اسے ابلیس کے پنجوں سے نجات دلواتا ہے اور گریشن (عشق و محبت کی نمائندہ محبوبہ) اس کی روح کو جنت میں لے جاتی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کی خصوصیت عقل نہیں بلکہ عشق ہے۔ ابلیس نے عقل کو اپنا رہنما بنایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملعون ہو گیا لیکن آدم نے عشق کو اپنا رہنما بنایا جس کے ثمرے میں وہ بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہو گیا۔ دیکھیے یہ اشعار:

ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست	ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
داند آں کو نیک بخت و محرم است	زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است [۵۷]
(رومی)

اقبال نے بالِ جبریل کی ایک غزل کے شعر میں رومی اور رازیؔ کو بالترتیب دو استعارے وجدان اور عشق (رومی) اور عقل و خرد (رازیؔ) کے توسط سے ایک طرح کے خلجان اور اضطراب کو آشکار کیا ہے جس کے اظہار میں بے اطمینانی بھی ہے اور ہیجان کی کیفیت بھی۔ دیکھیے یہ شعر۔

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں	کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی [۵۸]

دوسری جگہ کہتے ہیں:

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ	سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ [۵۹]

اقبال کے اشعار کے تجزیے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کو عقل کی افادیت سے انکار نہیں۔ اسے یک قلم مسترد نہیں کر دیتے لیکن عقل کے مقابلے میں وجدان (عشق) پر ان کا اصرار اس لئے زیادہ ہے کہ عشق کی رہبری کے بغیر عقل و علم کو اقبال بے دست و پا تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل جب سوز سے ہمکنار ہو جاتی ہے تو عشق بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں:

چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست؟	خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد [۶۰]

عقل عشق کا یہی امتزاج انسانی عمل کو سعادت کی راہ پر لے جاتا ہے۔ ان دونوں کے ملاپ میں رازِ ہستی مضمر ہے جو حقیقت کی گرہ کھولتی ہے۔ اگر عقل عشق کی شورشِ پنہاں میں شریک نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ دیکھیے یہ اشعار:

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار	شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں [۶۱]
عقل اندر حکمِ دل یزدانی است	چوں ز دل آزاد شد شیطانی است [۶۲]
علم بے عشق است از طاغوتیاں	علم با عشق است از لاہوتیاں [۶۳]

اقبال عقل و عشق کی ہم آہنگی کو تجدیدِ حیات و کائنات کا باعث تصور کرتے ہیں۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس　　　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس[۶۴]

رومی ایسے عشق کو عقل کلی کہتے ہیں اقبال کے نزدیک یہی عشق دانشِ برہانی سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ عشق کی ایسی صفت ہے جو انسان کو روحانی حقائق سے آشنا کرتے ہوئے منزل تک پہنچنے کا راستہ ہموار کرتا ہے جو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کا ضامن بنتا ہے۔ جذبہ عمل سے سرشار ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اقبال محض عقل و عشق کا امتزاج وانسلاک کے ہی خواہاں نہیں تھے بلکہ وہ اس کے بھی متمنی تھے کہ عقل مکمل طور پر دل کے تابع ہو جائے تا کہ وہ دوبارہ اپنے ابلیسی کردار کی طرف رجوع نہ ہو سکے۔

عقل اندر حکم دل یزدانی است　　　　چوں ز دل آزاد شد، شیطانی است[۶۵]

اس سلسلے میں اقبال کے اردو شعری مجموعوں سے اشعار ملاحظہ ہوں:

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدہ تصورات
صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق[۶۶]
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی[۶۷]
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں[۶۸]
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیؐ، عقل تمام بو لہب
گاہ بحیلہ می برد، گاہِ بزوری کشد
عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب[۶۹]

اقبال کے اردو شعری مجموعہ ''ضرب کلیم'' کی ایک نظم بہ عنوان ''علم و عشق'' میں بھی عشق کو عقل و علم پر فوقیت دی گئی ہے اور دونوں میں خط امتیاز کھینچتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ عقل یا علم کتابوں سے پیدا ہوتے ہیں اور عشق خود کتابوں کی ماں ہے یعنی کتابی علوم عشق کی زائیدہ ہیں۔ پوری نظم یہاں نقل کر دینا مناسب ہوگا۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ بن　　　　عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمینِ ظن
بندۂ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن　　　　عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات　　　　علمِ مقام صفات عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات		علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں		عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں		عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب
شرعِ محبت میں ہے عشرت منزل حرام		شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام		علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب [۲۰]

عقل و عشق کے تقابل کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اقبال عقل کے بالکل مخالف نہ تھے۔ اقبال صرف مابعد الطبیعاتی مسائل بالخصوص وجود خدا کے ادراک میں عقل کے مخالف تھے۔ وہ اس عقل خود بیں کے مخالف تھے جس کا سروکار ذاتی مفاد سے ہے لیکن وہ عقل جس کی حیثیت جہاں بیں کی ہے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ عقل و عشق کے اتحاد و انسلاک کے حوالے سے وہ ہمیشہ اس بات کے متمنی رہے کہ عقل کو مکمل طور پر دل کے تابع ہونا چاہیے۔ اگر علم و عقل روحانی حقائق سے آشنا ہو کر منزل تک پہنچنے کا راستہ ہموار کرتے ہوئے انسان کے دل میں اعلیٰ مقاصد کے لیے متحرک اور آرزو پیدا کرے تو وہ دانشِ برہانی (عشق) سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

> اقبال نے کئی مقامات پر اس بارے میں شرق و غرب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تاثرات نفسی یعنی عشق کو عقل یا زیرکی سے الگ کرنے سے مشرق بھی گمراہ ہوا اور مغرب بھی۔ دونوں بیک وقت ترقی کریں اور باہم معاون ہوں تو انسانیت ایک نیا عالم پیدا کر سکتی ہے۔ جس کا انداز حیات مشرق و مغرب دونوں سے افضل ہو۔ [۲۱]

یہ صحیح ہے کہ اقبال عقل و عشق دونوں میں اتحاد و انسلاک و ہم آہنگی کے مؤید رہے لیکن عشق کو عقل پر بہر حال تفوق حاصل ہے۔ عشق ہی وہ برقی توانائی ہے جو انسان کے اندر بصیرت اور قوت دونوں کا اضافہ کرتا ہے۔ عشق وہ قوت محرکہ ہے جو کاروان وجود کو ہر لحظہ نئی شان سے آگے بڑھاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ عقل سلیم کی وساطت سے آدم خاکی کو ذوق خدائی تک لے جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ عقل و عشق کا صحیح امتزاج ہو۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین:

> ''لفظ عشق کو اقبال نے نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی اور خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ عشق سے اقبال کی مراد وہ جوش وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔'' [۲۲]

مجھے کہنے دیجیے کہ اقبال کے یہاں عشق اور عقل کے مابین جو تقابلی پیش رفت ہے اور ان کی شاعری میں جو ہم یقین کا نور اور عشق کا سرور پاتے ہیں ان میں صحبت ''پیر روم' کا فیض ہے۔ تب ہی تو وہ کہتے ہیں کہ عمر بھر کعبہ و بت خانہ کے چکر سے وہ راز فاش نہیں ہوتا جو ایک لمحہ میں عشق کی منزل میں ایک دانائے

راز کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں [۴۳]

حوالہ جات وحواشی

۱- خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۱۹۴
۲- بوعلی سینا، مشمولہ فلسفۂ عجم اقبال، ۶۳-۶۴
۳- الفجر، ۸۹: ۲۷-۳۰
۴- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۵، بیت: ۳۸۵۴ سے ۳۸۵۶
۵- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۱، بیت: ۲۱ سے ۲۶
۶- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۵، بیت: ۲۰۱۲
۷- مولانا روم، دیوان شمس، رباعیات، رباعی نمبر ۴۱
۸- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۲، بیت: ۱۷۷۰
۹- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۱، بیت: ۱۱۰
۱۰- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۱، بیت: ۱۱۰
۱۱- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۳، بخش: ۱۸۴
۱۲- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۱، بخش: ۱۳۶
۱۳- مولانا روم، دیوان شمس، رباعیات، رباعی نمبر ۵۲۳
۱۴- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر: ۶، بیت: ۴۰۵۹
۱۵- دیوان
۱۶- مولانا روم، دیوان شمس، غزلیات، غزل نمبر ۴۵۵
۱۷- مولانا روم، دیوان شمس، غزلیات، غزل نمبر ۳۹۵
۱۸- دیوان
۱۹- یوسف سلیم چشتی، شرح جاوید نامہ حصہ اول، ص ۸۷
۲۰- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۶۱۰-۶۱۱
۲۱- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۷۸۱
۲۲- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۷۸۲
۲۳- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۷۳

۲۴- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص۱۰۹
۲۵- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص۳۰۳
۲۶- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۳۷۳
۲۷- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۴۱۸
۲۸- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۱۸۳
۲۹- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص۶۵۳
۳۰- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۱۳۸
۳۱- فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے، ص۱۲۲۵
۳۲- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۴۵۳
۳۳- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۳۴۸
۳۴- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۴۱۸
۳۵- خلیفہ عبد الحکیم، فکر اقبال، ص۲۰۴
۳۶- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر:۲، بیت ۱۷۷۰
۳۷- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۴۳۴
۳۸- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر:۱، بخش ۶، بیت ۱۱۳
۳۹- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر:۱، بخش ۱، بیت ۴
۴۰-
۴۱- مولانا روم، دیوان شمس، غزلیات، غزل نمبر ۱۰۷۵
۴۲- مولانا روم، دیوان شمس، غزلیات، غزل نمبر ۳۹۵
۴۳- مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر:۴، بخش ۵۲، بیت ۱۴۰۴ - ۱۴۰۶
۴۴- مولانا روم، دیوان شمس، غزلیات، غزل نمبر ۱۰۷۵
۴۵- مولانا روم، دیوان شمس، غزلیات، غزل نمبر ۱۳۲
۴۶- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۳۹۸
۴۷- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۳۸۵
۴۸- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۴۷۷
۴۹- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص۲۷۶
۵۰- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص۷۹۶
۵۱- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۳۶۷
۵۲- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۷۴۰
۵۳- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص۳۷۲
۵۴- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص۵۳۰

۵۵- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۳۷۵-۳۷۶
۵۶- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۳۷۶
۵۷- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۳۷۷
۵۸- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۵۶
۵۹- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۵
۶۰- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۲۰۷
۶۱- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۴۷
۶۲- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۸۴۰
۶۳- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۶۳
۶۴- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۵۳
۶۵- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۸۴۰
۶۶- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۳۷
۶۷- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۱۰
۶۸- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۲
۶۹- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۳۹
۷۰- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۳۹
۷۱- خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۱۹۸
۷۲- یوسف حسین خاں، روح اقبال، ص ۵۳
۷۳- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۴۶۵